Palestine's lament in Pakistani Urdu poetry

پاکستانی اردو نظم میں فلسطین کا نوحہ

Nazia Maqsood *[1]
MPhil Scholar, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad Campus
Dr.Muhammad Farooq Baig*[2]
Assistant Professor, Department of Urdu, Riphah International University, Faisalabad Campus

نازیہ مقصود☆[1]
ایم فل اردو سکالر، شعبہ اردو، رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس
ڈاکٹر محمد فاروق بیگ☆[2]
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، رفاہ انٹر نیشنل یونیورسٹی، فیصل آباد کیمپس

Correspondance: farooqbaig@hotmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 29-04-2026
Accepted:27-06-2026
Online:28-06-2026

Copyright:© 2026 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: This study examines the historical, cultural, and political dimensions of the Palestine issue and its profound representation in Pakistani Urdu poetry. Beginning with the sacred status of Palestine in Islamic tradition—highlighting its association with prophets, the first qibla, and the event of Miʿrāj—the article traces the region's historical evolution from the Abrahamic era through Persian, Hellenistic, Roman, and early Islamic periods. The research further explores how the Palestinian tragedy, shaped by colonial interventions and Zionist expansion, emerged as a central theme in Urdu resistance literature. Major poets such as Muhammad Iqbal, Faiz Ahmad Faiz, Habib Jalib, Ahmad Nadeem Qasmi, and Amjad Islam Amjad are analyzed for their poetic responses to Palestinian suffering, resistance, and human dignity. Their works transform Palestine from a geopolitical conflict into a universal symbol of oppression, resilience, and moral consciousness. The study concludes that Pakistani Urdu poetry has consistently upheld

Palestine as a metaphor for global justice, human rights, and collective resistance, thereby preserving its memory across generations.

KEYWORDS:Palestine; Urdu Poetry; Resistance Literature; Muhammad Iqbal; Faiz Ahmad Faiz; Habib Jalib; Islamic History; Colonialism; Zionism; Pakistani Literature; Middle East Conflict; Human Rights; Literary Representation; Cultural Memory.

مسئلۂ فلسطین بیسویں صدی کے اہم ترین سیاسی، تہذیبی اور انسانی المیوں میں شمار ہوتا ہے، جس نے نہ صرف مشرقِ وسطیٰ کی جغرافیائی ساخت کو بدل کر رکھ دیا بلکہ عالمی سیاست، امن و سلامتی اور بین الاقوامی قانون کے بنیادی اصولوں کو بھی چیلنج کیا۔ فلسطین کا مسئلہ اپنی اصل میں ایک نو آبادیاتی، نسلی، مذہبی اور سیاسی تنازع ہے جو تاریخی، مذہبی اور تہذیبی عوامل کے ساتھ ساتھ سامراجی طاقتوں کی مداخلت کے باعث ایک مستقل عالمی بحران کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ فلسطین وہ سرزمین ہے جسے اسلام میں ایک مرکزی، مقدس اور تاریخی مقام حاصل ہے۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس خطے کا تذکرہ براہِ راست یا بالواسطہ طور پر ملتا ہے۔ انبیائے کرامؑ کی اکثریت اسی خطے سے منسلک رہی، اور یہیں اسلامی تاریخ کے کئی بنیادی واقعات رونما ہوئے۔ سرزمین فلسطین نہایت مبارک اور محترم جگہ ہے۔ اس سرزمین پر اکثر انبیا اور رسل آئے ہیں۔ یہی وہ سرزمین رہی ہے جہاں سے معراج کی ابتدا اور انتہا ہوئی۔ یہ آسمان کا دروازہ ہے۔ یہ سرزمین محشر بھی ہے۔
سرزمین فلسطین کو قرآنِ کریم میں بابرکت زمین سے مخاطب کیا گیا ہے:

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔

پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے، اس لئے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہی خوب سننے دیکھنے والا ہے"(1)

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کا پہلا قبلہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے اطراف کو بابرکت کیا گیا ہے، یہ براہِ راست فلسطین کی فضیلت بیان کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں فلسطین (جس میں بیت المقدس اور اس کے اطراف کا پورا خطہ شامل ہے) کو بہت بلند اور مقدس مقام حاصل ہے۔ اگرچہ لفظ "فلسطین" بطورِ نام استعمال نہیں ہوا، مگر مسجدِ اقصیٰ، بیت المقدس، ارضِ مقدسہ، اور شام و اردن کے مبارک خطے کا بار بار ذکر آتا ہے۔ یہی خطہ آج کے فلسطین کا حصہ ہے۔ اسلامی تاریخ میں جب حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المقدس کو پرامن اور عادلانہ معاہدے کے تحت فتح کیا، تو اس کے بعد صدیوں تک مختلف مذاہب کے پیروکار یہاں امن و امان سے رہتے رہے۔ یوں فلسطین مسلمانوں کی سیاسی حکمت، معاشرتی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کا بھی تاریخی مرکز رہا ہے۔ اسی لیے ہر دور میں مسلم خلافتوں نے اسے خصوصی اہمیت دی خواہ وہ خلافتِ راشدہ ہو، بنو امیہ و بنو عباس ہوں، یا پھر عثمانی سلطنت۔ مسلمانوں نے فلسطین کو نہ صرف ایک مذہبی ورثہ سمجھا، بلکہ اسے اپنی تہذیبی شناخت اور سیاسی ذمہ داری کے طور پر بھی محفوظ رکھا۔ تاریخی طور پر فلسطین پر بیرونی حملے ہمیشہ امت کے اجتماعی شعور کو بیدار کرتے رہے اور مسلمان ہر دور میں اس سرزمین کے دفاع کو اپنا فرض سمجھتے رہے۔ فلسطین کا اسلامی پس منظر تین بنیادی نکات میں سمٹتا ہے۔ اول: انبیائے کرامؑ کی سرزمین، دوم: مسجد اقصیٰ اور واقعۂ معراج، سوم: پہلی قبلہ گاہ اور خلافتِ راشدہ کی عدل و انسانیت پر مبنی حکمرانی۔

فلسطین کی اسلامی تاریخ کا آغاز روایتی معنوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں انہیں "ابو الأنبیاء" کا مقام ملا ہے، اور ان کی ہجرت، قیام اور دعوت کا بڑا حصہ اسی سرزمین سے وابستہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دور میں فلسطین مختلف قبائل، مذاہب اور ثقافتوں کا مرکز تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے بابل (عراق) سے ہجرت کا حکم دیا، اور وہ فلسطین میں آکر آباد ہوئے۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

"وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ"

"اور ہم اسے اور لوط کو بچا کر اس زمین کی طرف لے آئے جس میں ہم نے
جہان کے لیے برکت"(2)

سورۃ الانبیاء کی آیت 71 کے مطابق، اللہ نے ابراہیمؑ اور لوطؑ کو اس سرزمین کی طرف بچا کر نکال دیا جس میں تمام جہان والوں کے لیے برکت رکھی گئی تھی۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ابراہیمؑ اور لوطؑ کی مدد کا ذکر کرتی ہے جب انہیں ان کی قوم سے محفوظ راستہ دکھایا گیا۔ اس سلسلے میں نگار سجاد ظہیر اپنی کتاب مسلہ فلسطین میں بیان کرتے ہیں۔

"جب حضرت ابرہیم علیہ السلام نے اپنے معاشرے میں توحید کا درس دینا
شروع کیا تو ان کے والد حکومت وقت بلکہ اکثر لوگ ان کے مخالف ہو گئے

یہاں تک کہ انہیں آگ میں ڈالے جانے کا واقعہ پیش آیا اور حضرت ابراہیم کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرت کرنی پڑی قرآن میں اس ہجرت کا تذکرہ ہے اور ان کی جائے ہجرت کو وہ سرزمین کہا گیا ہے جس میں دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی گئی ہیں یعنی شام و فلسطین کا علاقہ اس کی برکتیں مادی بھی ہیں اور روحانی بھی مادی حیثیت سے وہ دنیا کے زرخیز علاقوں میں سے ہے اور روحانی حیثیت سے وہ دو ہزار سال تک انبیاء علیہ السلام کی مہبط رہی ہے دنیا کے کسی دوسرے خطے میں اتنی کثرت سے انبیاء معبوث نہیں ہوئے۔ اسی لیے فلسطین کو "معدن الانبیاء" کہا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم اپنے آبائی وطن سے ہجرت کر کے فلسطین (شام) چلے گئے ہجرت کرنے والوں میں حضرت لوط بھی شامل تھے یہیں حضرت ابراہیم کی اولادیں پیدا ہوئیں"[3]

فلسطین کی ابتدائی اور کلاسیکی تاریخ کا آغاز سامی اقوام کے دور سے ہوتا ہے، جو مشرقِ قدیم کے تہذیبی نقشے میں نمایاں مقام رکھتی تھیں، اور انہی اقوام کے تناظر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد فلسطین کی روحانی، تمدنی اور مذہبی بنیادوں کی تعمیر میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سامی تہذیب بنیادی طور پر اس نسل سے منسوب ہے جو نوعیت کے لحاظ سے خالص مشرقِ وسطیٰ کی اقوام پر مشتمل تھی جن میں کنعانی، عموری، یبوسی، آرامی، نبطی اور عبرانی قبائل شامل تھے۔ اور یہی قبائل قدیم فلسطین کے اصل باسی تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ خطہ اس زمانے میں مذہب، تجارت، زراعت اور تمدن کا ایسا گہوارہ تھا جس نے نہ صرف مقامی قبائل میں روابط قائم کیے بلکہ بیرونی سلطنتوں کے درمیان بھی ایک اسٹریٹجک مرکز کی حیثیت اختیار کر لیا تھا۔ ایسے ہی ماحول میں حضرت ابراہیمؑ کی بعثت اور ان کی ہجرت فلسطین کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرآن کریم نے "اِمام"، "حنیف"، "خلیل اللہ" اور "اَبُوالاَنبیاء" جیسے عظیم القاب سے نوازا ہے، جو ان کی عالمگیر حیثیت اور ان کی دعوت کی روحانی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ قرآن کے مطابق، جب حضرت ابراہیمؑ اپنے معاشرے میں توحید کی دعوت لے کر اُٹھے، تو ان کے والد آزر، قبائلی سردار اور حکومتی طبقہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔

حتیٰ کہ انہیں آگ کے الاؤ میں ڈالا گیا۔[4]

اس آزمائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہجرت کا حکم دیا، چنانچہ وہ بابل (موجودہ عراق) سے نکل کر شام و فلسطین کے خطے میں آ گئے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

"وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ "[5]

مفسرینِ کرام ابنِ کثیر، طبری، قرطبی سب لکھتے ہیں کہ "بابرکت زمین" سے مراد شام، فلسطین اور بیت المقدس کا پورا خطہ ہے جو روحانی، مادی اور تہذیبی لحاظ سے برگزیدہ ہے۔ یہی ہجرت ابراہیمی روایات کی بنیاد بن گئی جس نے بعد کے تمام مذاہب اسلام، یہودیت اور مسیحیت کو ایک مشترکہ مرکز فراہم کیا۔

> حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فلسطین آمد محض اقامت یا ہجرت کا واقعہ نہیں بلکہ مشرقِ قریب میں توحید کے نئے دور کا آغاز تھا۔ فلسطین میں آمد کے بعد انہوں نے نہ صرف اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ یہی خطہ ان کی نسلوں کے ارتقاء کا مرکز بن گیا۔ حضرت لوطؑ بھی ان کے ساتھ شام و فلسطین پہنچے۔[6]

> اور اسی خطے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کے بعد بنی اسرائیل کے طویل سلسلے کو جنم دیا۔ اس لحاظ سے فلسطین کو "معدن الأنبياء" (انبیا کی کان) کہا جاتا ہے، کیونکہ دنیا کے کسی خطے میں اتنی کثرت سے انبیاء نہیں آئے جتنے اس خطے میں مبعوث ہوئے۔[7]

سامی دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ تہذیبی طور پر نہایت متنوع تھا۔ کنعانی قوم نے یہاں زراعت، فنِ تعمیر، خط نویسی، تجارت اور بحیرۂ روم کے ساتھ سمندری روابط کو فروغ دیا۔ فلسطین کے شہروں حبرون، یروشلم (یبوسیوں کا شہر)، جریکو میں اس دور میں ابتدائی شہری تہذیبیں وجود میں آئیں، جنہوں نے آنے والی تہذیبوں کی بنیاد رکھی۔ اسی زمانے میں مذہبی تصورات میں بھی خاصی تبدیلیاں آئیں؛ مقامی قبائل کثیر خدائی مذہب پر عمل کرتے تھے، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کے جس صاف اور واضح پیغام کی دعوت دی، وہ فلسطینی معاشرے کے فکری ڈھانچے میں ایک انقلابی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ کی فلسطین میں موجودگی نے اس سرزمین کو اعلیٰ روحانی مرکزیت عطا کی۔ یہاں انہوں نے مختلف علاقوں میں قیام کیا، مساجد اور عبادت گاہوں کے آثار چھوڑے، قربانی کے واقعات پیش آئے، اور یہی ان کی نسل کا بنیادی وطن بنا۔ تاریخی منابع طٰہٰ حسین، ولیم ڈیور، فلپ حتی، اور ابنِ اسحاق لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے زیادہ طویل قیام فلسطین کے علاقے حبرون (الخلیل) میں کیا جہاں ان کی قبر بھی موجود ہے۔ اس طرح فلسطین محض کسی ایک مذہب کا مرکز نہیں بلکہ تینوں ابراہیمی مذاہب کا مقدس مقام بن گیا، اور اس تقدیس کی بنیاد سامی عہد میں رکھی گئی۔

اس دور کا آغاز اس وقت ہوا جب ایرانی فرمانروا کوروش کبیر نے بابل فتح کیا اور فلسطین سمیت پورا علاقہ ایرانی سلطنت کا حصہ بن گیا۔539ق م میں کوروش اعظم نے بابل پر قبضہ کیا۔بابل چونکہ فلسطین، یروشلم اور پورے "صوبۂ شام" پر حکمران تھا، اس لیے فلسطین خود بخود ایرانی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ایرانی سلطنت نے اس علاقے کو "فارس صوبۂ شام کے طور پر منظم کیا۔کوروش اعظم نے جلاوطن یہودیوں کو اجازت دی کہ وہ بابل سے واپس فلسطین آکر اپنے وطن میں آباد ہو سکیں۔ اسی دور میں ہیکلِ سلیمانی کی دوبارہ تعمیر شروع کی گئی یروشلم کی مذہبی حیثیت دوبارہ بحال ہوئی۔ایرانی حکمران دارااول اور ارتخشستانے اس تعمیر میں مالی مدد بھی دی۔ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر کے مطابق:

> 539ق م میں ایرانی بادشاہ سائرس نے نہ صرف بابل کی حکومت کا خاتمہ کیا بلکہ اس کے مقبوضہ علاقے شام اور فلسطین پر بھی قبضہ کر لیا اہل شام کے لیے ایرانی تلسلط تر مبارک ثابت ہوا وہ ہزاروں یہودی جن کو بخت نصر غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا ایرانی دور میں انہیں شام و فلسطین واپس آنے کا موقع مل گیا انہوں نے تباہ شدہ ھیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کیا-اس عرصے میں حضرت عزیر نے دین موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا انہوں نے تورات کو مرتب کیا قوانین شریعت کو نافذ کرایا اور بنی اسرائیل سے از سر نو خدا کی بندگی اور اطاعت کا وعدہ لیا اہل شام تقریبا دو سو سال تک ایران کے ہنخامنشی بادشاہوں کی رعایا کے طور پر رہے پھر یونان سے اٹھنے والی فتوحات کی لہر نے انہیں یونانیوں اور پھر رومیوں کی رعایا بنادیا۔(8)

332ق م میں سکندر اعظم نے ایرانی سلطنت کو شکست دی۔یوں فلسطین ایرانی دور سے نکل کر یونانی ہیلینسٹک دور میں داخل ہو گی۔ایرانی دور میں فلسطین ہخامنشی سلطنت کے مشہور انتظامی یونٹ "یہود مدینہ کا اہم حصہ تھا۔اس دور میں انتظامی ڈھانچے کی تنظیمِ نو کی گئی، جس کا مقصد نہ صرف سیاسی استحکام تھا بلکہ معاشی بحالی بھی تھی۔ایرانی حکمرانوں کی پالیسی تھی کہ مقامی قیادت کو محدود سطح پر اختیارات دیے جائیں، جس سے فلسطین میں مذہبی اداروں خصوصاً یروشلم میں موجود مقدس معبد کو قدرے آزادی ملی۔ایرانی دستاویزی روایت، جیسے داریوش اوّل کے شاہی کتبے، اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ریاستی نظم و نسق کی مرکزیت کے باوجود مقامی وحدتوں کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔یہ حکمتِ عملی فلسطین جیسے حساس مذہبی خطے کے لیے امن و استحکام کا ذریعہ بنی، اور اسی ماحول نے آنے والے صدیوں کے ثقافتی و مذہبی تنوع کی بنیاد رکھی۔

فلسطین کی تاریخ میں یونانی یا ہیلینسٹک دور ایک عظیم تہذیبی و سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ تھا جس کا نقطۂ آغاز 332 قبل مسیح میں اس وقت ہوا جب سکندر اعظم نے سلطنتِ فارس کو شکست دے کر پورے مشرقِ قریب، مصر اور شام کے بعد فلسطین پر بھی اپنا تسلط قائم کیا۔ سکندر کی آمد محض ایک فوجی فتح نہ تھی بلکہ یہ ایک ایسے تہذیبی انقلاب کا دروازہ تھا جو صدیوں تک مشرقِ نزدیک کی شناخت، فنون، زبان، انتظامی ڈھانچے اور ثقافتی میلانات کو متاثر کرتا رہا۔ سکندر کی فتوحات نے فلسطین کی جغرافیائی و سیاسی حیثیت کو ایک نئے عالمی نظام کا حصہ بنا دیا، جسے تاریخ میں ہیلینزم کہا جاتا ہے یعنی یونانی تہذیب اور مقامی مشرقی روایات کا امتزاج۔

> چوتھی صدی قبل مسیح کا سب سے بڑا عالمی واقعہ سکندر کی فتوحات کا آغاز تھا۔یونان کی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ کا بیٹا سکندر اپنی مشرقی اور مغربی فتوحات کے لیے تاریخ میں مشہور ہے۔ان فتوحات کے نتیجے میں شام ،عراق اور ایران کے علاقے کے قبضے میں چلے گئے 333ق م میں سکندر نے ایران کے ہنحامنشی بادشاہ داراسوئم کو شکست دی جس کے نتیجے میں وہ تمام مقبوضات جو ایران کے قبضے میں تھے یونان کے تسلط میں چلے گئے۔
> "(9)

سکندر اعظم نے اپنے مختصر مگر انتہائی اثر انگیز دورِ حکومت میں فلسطین کو اپنی سلطنت کے انتظامی نقشے میں حکمتِ عملی کی بنیاد پر شامل کیا۔ فلسطین کی جغرافیائی حیثیت جس میں ایک جانب مصر اور دوسری جانب شام و بین النہرین جیسے طاقتور مراکز شامل تھے۔ اسے یونانی فوجی مہمات اور تجارتی راستوں کے لیے ناگزیر خطہ بنا دیا۔ سکندر نے فلسطین میں داخل ہونے کے بعد نسبتاً پر امن حکمت عملی اپنائی، خصوصاً یروشلم کے حوالے سے اس نے رعایتیں دیں، جیسا کہ بعض یونانی مؤرخین ارسطو کے شاگرد کلیار خُس اور بعد ازاں یوسی بیو سبیان کرتے ہیں کہ سکندر نے مذہبی آزادی اور مقامی قوانین کے تسلسل کو برقرار رکھا۔

سکندر کی اچانک وفات (323 قبل مسیح) کے بعد اس کی وسیع سلطنت اس کے جرنیلوں کے درمیان تقسیم ہو گئی، اور فلسطین دو طاقتور یونانی خاندانوں کے درمیان مسلسل کشمکش کا مرکز بنا رہا۔ بطالسی سلطنت: مصر سے حکومت اور سلیوسی سلطنت: شام سے حکومت۔

یہ کشمکش تقریباً ایک صدی تک جاری رہی۔ ابتدا میں فلسطین بطالسی حکمرانوں کے زیرِ اثر رہا، جنہوں نے قدرے لچکدار پالیسی اپنائی۔ ان کے دور میں فلسطین میں تجارت کو فروغ ملا، یونانی طرزِ تعلیم، فلسفہ اور زبان (عام ہوئی، اور اس خطے کے

شہری مراکز، بالخصوص غزہ اور یروشلم، میں یونانی طرز کی اصلاحات متعارف ہوئیں۔ بطالسی دور میں مالیاتی نظام مضبوط ہوا اور فلسطین کو مصر اور شام کے درمیان ایک فعال تجارتی مرکز بنا دیا گیا۔

بعد ازاں 200 قبل مسیح کے قریب فلسطین سلیوسی حکمران انطیوکس سوم کے زیرِ نگیں آ گیا، جس نے ابتدا میں نرم پالیسی اپنائی مگر اس کے جانشین انطیوکس چہارم اپی فینیز نے انتہائی سخت اور جابرانہ اقدامات کیے۔ اس کے دور میں یونانی ثقافت کو ایک سلطنتی نظریے کے طور پر نافذ کرنے کی شدید کوشش کی گئی۔ اس نے یروشلم کے مقدس معبد میں یونانی دیوتا زیوس کے نام پر قربان گاہ قائم کی، ختنہ، تورات کی تعلیم اور مذہبی رسومات پر پابندی لگائی، جس سے فلسطین میں شدید بغاوت بھڑک اٹھی۔ یہ بغاوت "خاندانِ مکابی" کے نام سے مشہور ہے، جس نے فلسطین کی مذہبی و سیاسی تاریخ پر گہرے اثرات چھوڑے۔ مکابیوں نے کچھ عرصے کے لیے مقامی حکومت قائم کی، مگر یونانی اثرات سماجی سطح پر قائم رہے۔

یونانی دور میں فلسطین نے اقتصادی اعتبار سے بھی ایک نئی جہت اختیار کی۔ یونانی شاہراہوں، تجارتی راستوں اور بحری نیٹ ورکس نے فلسطین کی بندرگاہی سرگرمیوں میں اضافہ کیا۔ عسقلان، غزہ اور جافا جیسے شہر تجارتی مراکز کے طور پر ترقی پانے لگے۔ سکے سازی کے نظام میں بھی یونانی معیار اپنایا گیا، جو بین الاقوامی تجارت میں آسانی کا باعث بنا۔ سیاسی اعتبار سے یونانی دور مسلسل کشمکش اور تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ یونانی حکمرانوں کی باہمی رقابت نے فلسطین کو فوجی تصادم کے لیے ایک حساس خطہ بنا دیا۔ تاہم اس تمام شورش کے باوجود فلسطین کے سماجی ڈھانچے میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی—وہ یہ کہ مقامی آبادی نے پہلی مرتبہ یونانی طرزِ حیات اور مشرقی روایات کے امتزاج سے پیدا ہونے والی نئی تہذیب کا تجربہ کیا۔ یہ تہذیب نہ مکمل طور پر یونانی تھی اور نہ مکمل طور پر مشرقی؛ بلکہ اسے ایک بین الثقافتی دنیا کہا جا سکتا ہے، جہاں تہذیبیں ایک دوسرے سے ٹکراتی بھی تھیں اور ملتی بھی تھیں۔

فلسطین کی تاریخ میں رومی دور ایک ایسا اہم اور نازک مرحلہ تھا جس نے نہ صرف خطے کے سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کو بدل دیا بلکہ اس کی مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی شناخت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ 63 قبل مسیح میں رومی جنرل پومپیو نے فلسطین کو رومی سلطنت میں شامل کیا اور اس کے بعد تقریباً چھ سو سال تک یہ خطہ رومی قیادت کے زیرِ اثر رہا۔ رومی دور فلسطین کے لیے سیاسی لحاظ سے ایک سخت مگر منظم دور تھا، جس میں مقامی قبائل کو محدود خود مختاری دی گئی، جبکہ اصل اقتدار رومی گورنروں اور فوجی حکام کے ہاتھ میں رہا۔ رومی حکمرانوں نے فلسطین کو ایک اسٹریٹجک صوبے کی حیثیت سے دیکھا کیونکہ یہ مصر، شام اور مشرقِ بعید کے تجارتی راستوں اور فوجی مواصلات کا مرکز تھا۔

> یونانیوں کے سیاسی جانشین رومی ہوئے۔ جس زمانے میں یونانی سلطنت رومیوں کے ہاتھوں تباہی کے دہانے پر تھی تو فلسطین کے یہودیوں نے اس موقع پر خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی یہ وہ زمانہ تھا جب

مکابی تحریک کے نتیجے میں ان کی اپنی قائم کی ہوئی مذہبی ریاست بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ یونانیوں کے خلاف مکابی تحریک جس اخلاقی اور دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں اتحاد و اتفاق بھی باقی نہ رہا اس انتشار کے زمانے میں انہوں نے رومی فاتحہ پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی تو 23 ق م میں میں رومی جرنیل فلسطین آیا اور یروشلم (بیت المقدس) پر قبضہ کر لیا۔ رومی فاتحین کی یہ پالیسی تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں پر براہ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعے حکومت قائم کرتے لہٰذا انہوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک مقامی نظم قائم کر دیا یہ حکومت 40 ق م میں ایک ہوشیاری یہودی ہیرود کے قبضے میں آئیں۔"(10)

مذہبی اور سماجی لحاظ سے رومی دور فلسطین کی تاریخ میں سب سے زیادہ پیچیدہ اور حساس مرحلہ تھا۔ اس دور میں یروشلم کا معبد، جو یہودی مذہب کا سب سے مقدس مرکز تھا، رومی تسلط کے تحت آ گیا اور اس کی نگرانی رومی حکام کے ہاتھ میں تھی۔ 70 عیسوی میں رومی جنرل ٹیٹیس نے یہودی بغاوت کو کچلنے کے لیے معبدِ سلیمانی کو منہدم کر دیا، جس سے نہ صرف مذہبی صدمہ ہوا بلکہ یہودی کمیونٹی کی سیاسی اور معاشرتی طاقت بھی کمزور ہوئی۔ اس کے بعد رومیوں نے شہر کا نام بدل کر ایلیہ کپٹولینا رکھ دیا اور رومی دیوتاؤں کے لیے عبادت گاہیں قائم کیں۔ اس تاریخی واقعے نے فلسطین میں مذہبی شناخت اور مقامی آبادی کے شعور پر دیرپا اثر ڈالے، اور یروشلم کے مرکزیت کو ایک عالمی مذہبی مسئلے میں تبدیل کر دیا۔

حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں فلسطین کی سرزمین مذہبی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے ایک انتہائی اہم مقام رکھتی تھی اور یہ خطہ عرب کے شمال میں، شام اور مصر کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے ایک قدرتی اور اسٹریٹجک پل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس خطے کی مذہبی اہمیت کی بنیاد قرآن کریم میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے، جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"سبحان الذي أسرى بعبده ليلًا من المسجد الحرام إلى المسجد الأقصى"(11)

جو مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی روحانی عظمت کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فلسطین کو بابرکت زمین قرار دیا:

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (12)

جو اس خطے کی مادی اور روحانی برکت کی نشاندہی کرتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے دور میں فلسطین نہ صرف تاریخی اعتبار سے انبیاء کے مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا بلکہ مسلمانوں کے لیے ایک مقدس اور عقیدتی وابستگی کا مرکز بھی تھا، کیونکہ یہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور دیگر انبیاء کی بعثت اور قیام کی داستانیں جڑی ہوئی تھیں۔

حضرت محمد ﷺ کے دور میں فلسطین کی مذہبی اہمیت کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ یہ سرزمین انبیاء کے تاریخی اور روحانی تسلسل کا حصہ تھی۔ قرآن کریم میں بیت المقدس اور اس کے اطراف کے علاقوں کا ذکر بار بار آیا ہے، اور مسلمانوں کے عقیدے میں یہ وہ جگہ ہے جہاں متعدد انبیاء نے قیام اور تبلیغ کی۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطین کو نہ صرف پہلے قبلہ کے طور پر احترام حاصل تھا بلکہ بعد میں اس کی فضیلت مسلمانوں کے لیے دوامِ عقیدہ اور روحانی وابستگی کا ذریعہ بنی۔ حضرت محمد ﷺ نے اس کی اہمیت کی طرف واضح اشارہ کیا، تاکہ امت مسلمہ کے شعور میں فلسطین کی تاریخی اور مذہبی اہمیت قائم رہے۔

> ساتویں صدی عیسوی کا سب سے عظیم اور انقلابی عالمی واقعہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تھی، جس نے نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ پوری دنیا کی مذہبی، سماجی، سیاسی اور تہذیبی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ آپؐ کی دعوتِ توحید نے ایک منتشر، قبائلی اور باہمی جنگوں میں الجھی ہوئی قوم کو نہ صرف فکری و اخلاقی طور پر نئی زندگی بخشی بلکہ انہیں ایک منظم سیاسی قوت میں تبدیل کر دیا۔ اسلام کے پیغام نے عرب معاشرے میں وحدت، عدل، مساوات اور اخوت کے اصول راسخ کیے، جو آگے چل کر ایک مضبوط ریاست کی بنیاد بنے۔ مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام نے پہلی مرتبہ عربوں کو ایک واضح سیاسی شناخت فراہم کی، اور یہی وہ نقطہ آغاز تھا جہاں سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔[13]

اقتصادی اور جغرافیائی اعتبار سے فلسطین کا مقام بھی نمایاں تھا۔ یہ خطہ مصر، شام، اور جزیرہ نما عرب کے درمیان ایک تجارتی اور فوجی راستہ فراہم کرتا تھا، جس سے یہ خطہ نہ صرف تجارت بلکہ ثقافتی تبادلے کا بھی مرکز بن گیا۔ فلسطین میں موجود مقامی قبائل، بشمول یہودی، عیسائی اور سامی قبائل، عرب قبائل کے ساتھ قافلوں کی تجارت، زراعت اور دیگر اقتصادی سرگرمیوں میں ملوث تھے، جس سے خطے کی معیشت مستحکم ہوئی اور فلسطین کی سماجی و معاشرتی ڈھانچہ مضبوط ہوا۔

خلیفہ راشدین کے دور میں اسلام کی ترویج اور مسلم ریاست کی توسیع نے مشرق وسطیٰ کے سیاسی، سماجی اور مذہبی نقشے کو بنیادی طور پر تبدیل کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں ابتدائی فتوحات کا آغاز جزیرہ نما عرب سے ہوا، جس میں نہ

صرف قبائل کو متحد کیا گیا بلکہ مرتدوں کی تحریکیں بھی ختم کی گئیں اور داخلی استحکام قائم ہوا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے دور میں مسلم ریاست نے ایک منظم فوجی اور انتظامی حکمت عملی کے تحت خارجہ فتوحات کا آغاز کیا، جس میں شام، عراق، مصر اور بالآخر فلسطین شامل تھے۔ فلسطین کی فتح کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ یہ خطہ بازنطینی سلطنت کے مشرقی حصے میں شامل تھا اور اس کی جغرافیائی حیثیت تجارتی اور فوجی اعتبار سے نہایت اہم تھی، کیونکہ یہ مصر، شام اور جزیرہ نما عرب کے درمیان ایک قدرتی پل کا کام دیتا تھا۔

> 13ھ میں حضرت ابو بکر صدیق جو مسلمانوں کے پہلے خلیفہ مقرر ہو چکے تھے۔ کبار صحابہ کی مشورے سے شام پر فوج کشی کا فیصلہ کیا------30 جولائی 634 کو فیصلہ کن معرکہ اجنادین میں عربوں نے بازنطینیوں کو تباہ کن شکست دی، اجنادین کا مقام بیت المقدس اور بیت جبرین کے درمیان واقع ہے اس کے بعد یکے بعد دیگرے شامی شہر فتح ہوتے چلے گئے -واقدی اس کو " آسان فتح" کہتا ہے جنگ یرموک (30 اگست 636) نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا-جب اس فتح کی خبر حضرت ابو بکر کو ملی تو وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔"(14)

فتح فلسطین کی مہم میں مسلمانوں نے اپنی فوجی حکمت عملی کے ذریعے رومی افواج کو شکست دی، اور مقامی یہودی و عیسائی قبائل کے ساتھ عارضی معاہدات کیے تاکہ امن قائم رہے اور علاقے میں استحکام پیدا ہو۔ یرموک کی جنگ، جو 636ء میں ہوئی، اس فتح کا سب سے اہم مرحلہ تھی، جس میں رومی فوج کو تاریخی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ کے بعد فلسطین اور شام کے دیگر حصے مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے، اور رومی سلطنت کا مشرقی اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ یرموک کی فتح اسلامی تاریخ میں ایک سنگ میل کے طور پر شمار کی جاتی ہے کیونکہ اس نے نہ صرف فلسطین کی آزادی کی راہ ہموار کی بلکہ مسلمانوں کو شام اور اردن کی طرف توسیع کے لیے موقع فراہم کیا۔ فتح فلسطین کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنی حکمت عملی کے تحت مقامی آبادی کے حقوق کو تسلیم کیا اور انہیں اپنی مذہبی رسومات جاری رکھنے کی اجازت دی، جبکہ زمینوں اور املاک کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا۔ فلسطین میں مسلمانوں نے انتظامی ڈھانچہ قائم کیا، ٹیکس جمع کرنے کا نظام متعارف کرایا اور مقامی قبائل کو اسلامی قوانین کے مطابق حکومت میں شامل کی۔ یروشلم کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ نے تاریخی معاہدہ کیا، جسے معاہدہ عمرؓ کہا جاتا ہے، جس میں یہودی اور عیسائی کمیونٹیز کے مذہبی مراکز کی حفاظت اور شہری حقوق کی ضمانت دی گئی۔

اردو شاعری میں فلسطین کا ابتدائی تاثر دراصل شاعر کے اس حساس شعور کی توسیع ہے جو انسانیت کے دکھ کو اپنے ذاتی دکھ کی طرح محسوس کرتا ہے، کیونکہ شاعر اور تخلیق کار معاشرے کا سب سے حساس اور ذمہ دار فرد ہوتا ہے، عام آدمی کی سوچ جب کسی حد پر جا کر ٹھہر جاتی ہے وہیں سے تخلیق کار کی فکر کا آغاز ہوتا ہے، عام فرد کسی سانحے، ظلم یا المیے کو دیکھ کر وقتی طور پر افسردہ ہو جاتا ہے، اس کی آنکھ نم ہوتی ہے، دل بوجھل ہوتا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ روزمرہ زندگی کی مصروفیات اسے اس کیفیت سے باہر نکال لاتی ہیں، اس کے برعکس شاعر کسی بھی سانحے کے کرب کو نہایت گہرائی سے محسوس کرتا ہے، وہ اس درد کو صرف دیکھتا نہیں بلکہ اپنے وجود میں جذب کر لیتا ہے، اس کا دل مسلسل اضطراب میں مبتلا رہتا ہے اور یہی اضطراب آخر کار لفظوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے، فلسطین کا المیہ بھی اردو شاعری میں اسی شدید داخلی کرب کے ساتھ داخل ہوا۔

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ میرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عُقدہء دُشوار
تُرکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پنجے میں گرفتار[15]

بیسویں صدی کے اوائل میں جب فلسطین پر سامراجی قوتوں اور صہیونی عزائم کے سائے گہرے ہونا شروع ہوئے تو برصغیر کے اہلِ قلم نے اسے محض ایک سیاسی واقعہ نہیں سمجھا بلکہ انسانیت پر ایک کاری ضرب کے طور پر دیکھا، اردو شاعر نے فلسطین کو صرف ایک خطۂ زمین کے طور پر نہیں برتا بلکہ اسے مظلوم انسان، زخمی ماں، معصوم بچے، بے گھر خاندان اور جلتے ہوئے خواب کی علامت بنا کر پیش کیا، ابتدائی اردو شاعری میں فلسطین کا ذکر اگرچہ محدود تھا مگر اس میں جذبات کی شدت اور اخلاقی احتجاج واضح تھا، یہ وہ دور تھا جب عالمِ اسلام میں سیاسی بیداری جنم لے رہی تھی اور اردو شاعری اس بیداری کا موثر ذریعہ بن رہی تھی، اقبال جیسے مفکر شاعر نے امتِ مسلمہ کے زوال اور فلسطین جیسے مسائل کو ایک بڑے فکری تناظر میں دیکھا، اگرچہ اقبال نے فلسطین کو براہِ راست بہت کم موضوع بنایا مگر ان کی شاعری میں موجود ملت، خودی اور استعمار مخالف فکر نے بعد کے شعرا کو اس مسئلے پر آواز اٹھانے کا حوصلہ دیا، آزادی کے بعد اردو شاعری میں فلسطین کا تاثر مزید واضح اور دوٹوک ہوتا گیا، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی اور دیگر ترقی پسند شعرا نے فلسطین کے المیے کو استحصالی نظام کے خلاف جدوجہد کی علامت کے طور پر پیش کیا، ان کے نزدیک فلسطین صرف عربوں یا

مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کا دکھ تھا، یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں فلسطین کے ابتدائی تاثر میں مذہبی ہمدردی کے ساتھ ساتھ انسانی ضمیر کی بیداری بھی نظر آتی ہے۔

اردو مزاحمتی ادب میں مسئلۂ فلسطین ایک نہایت اہم، حساس اور زندہ موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے، جس نے مختلف ادوار کے شعرا اور ادیبوں کے فکر و احساس کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس سلسلے کی ابتدائی اور سب سے مؤثر آواز علامہ محمد اقبال کی ہے، جنھوں نے فلسطین کو صرف ایک سیاسی تنازع کے طور پر نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کی تہذیبی، دینی اور اخلاقی شناخت کے مسئلے کے طور پر دیکھا۔ اقبال کی فکر میں فلسطین محض ایک سرزمین نہیں بلکہ اسلامی شعور، قبلۂ اوّل اور ملتِ اسلامیہ کی وحدت کی علامت ہے۔ ان کی تصنیف بالِ جبریل میں شامل نظم "ذوق و شوق" فلسطین سے ان کی قلبی وابستگی اور روحانی تعلق کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ اقبال نے فلسطین کے حسنِ فطرت، مسجدِ اقصیٰ کی عظمت اور امتِ مسلمہ کے زوال کو ایک ساتھ جوڑ کر ایسا فکری منظر نامہ تخلیق کیا جس میں درد، بیداری، احتجاج اور امید ایک دوسرے میں مدغم دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسطین کا مسئلہ صرف زمین کے قبضے کا مسئلہ نہیں بلکہ تہذیب، تاریخ، شناخت اور روحانی مرکزیت کے تحفظ کی جنگ ہے۔ اسی لیے انہوں نے مغربی استعمار، صہیونی عزائم اور عالمی طاقتوں کی منافقانہ سیاست کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اقبال کی نظم "شام و فلسطین" میں یہ احتجاج زیادہ واضح اور براہِ راست صورت میں سامنے آتا ہے، جہاں وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق تسلیم کیا جا سکتا ہے تو پھر ہسپانیہ پر عربوں کے حق کو کیوں فراموش کیا جا رہا ہے۔ یہ سوال دراصل عالمی سیاست کے دوہرے معیار کے خلاف ایک فکری احتجاج ہے۔ اقبال نے اپنے خطوط، خطبات اور سیاسی بیانات میں بھی فلسطین کے مسئلے پر کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ محمد علی جناح کے نام اپنے خط میں انہوں نے فلسطین کو پوری امتِ مسلمہ کا مشترکہ مسئلہ قرار دیا اور اس کے لیے جیل جانے تک کی آمادگی ظاہر کی۔ ان کے نزدیک فلسطین ایشیا کا دروازہ تھا اور اس پر صہیونی قبضہ صرف عربوں ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لیے خطرہ تھا۔ اقبال کا یہ فکری شعور بعد کے اردو مزاحمتی ادب کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے، جس نے فلسطین کو ظلم، استعمار اور انسانی المیے کی علامت کے طور پر اپنایا۔

> "میں فلسطین کے مسئلے کیلئے جیل جانے کیلئے تیار ہوں، اس لیے کہ مَیں جانتا ہوں کہ فلسطین نہ فقط ہندستان کیلئے، بلکہ اسلام کیلئے بہت عظیم ہے یہ ایشیا کا دروازہ ہے، جس پر بُری نیت سے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔"(16)

اقبال کے بعد اردو شاعری میں فلسطین کے موضوع کو سب سے زیادہ وسعت اور گہرائی فیض احمد فیض نے عطا کی۔ ترقی پسند تحریک کے پس منظر میں فیض نے فلسطین کو عالمی استعمار، انسانی ظلم اور محکوم اقوام کی جدوجہد کے استعارے کے طور پر پیش کیا۔ ان کی شاعری میں فلسطین صرف عرب دنیا کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کے ضمیر کا سوال بن جاتا ہے۔ فیض

کی نظم "فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے" اردو مزاحمتی ادب کا ایک شاہکار ہے، جس میں وہ فلسطینی شہداء کے لہو کو آزادی اور امید کی علامت بناتے ہیں۔ نظم کے اشعار "میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد" اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ظلم اگرچہ ایک سرزمین کو تباہ کر سکتا ہے، لیکن قربانی اور مزاحمت نئی زندگیوں اور نئے شعور کو جنم دیتی ہے۔ فیض کی شاعری میں فلسطینی عوام کی بے گھری، جلاوطنی، قربانی اور استقامت نہایت درد انگیز مگر باوقار انداز میں سامنے آتی ہے۔ ان کی نظم "ایک ترانہ، مجاہدینِ فلسطین کے لیے" فلسطینی جدوجہد کی امید، عزم اور فتح کے یقین کی علامت ہے۔ "ہم جیتیں گے، حقا ہم اک دن جیتیں گے" جیسے مصرعے محض شعری نعرے نہیں بلکہ ایک محکوم قوم کے اجتماعی حوصلے کی ترجمانی کرتے ہیں۔ فیض نے فلسطینی بچوں، عورتوں اور شہداء کے دکھ کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ "فلسطینی بچے کے لیے لوری" میں انہوں نے معصوم بچوں کی محرومی، خوف اور جنگی تباہی کو انتہائی سادہ مگر دل سوز انداز میں بیان کیا۔ یہ نظم صرف ایک بچے سے خطاب نہیں بلکہ پوری دنیا کے ضمیر سے سوال ہے کہ آخر معصوم انسانوں کا قصور کیا ہے۔ فیض کی شاعری فلسطین کو انسانی وقار، آزادی اور مزاحمت کی ایسی علامت میں بدل دیتی ہے جو ہر دور میں زندہ رہتی ہے۔

میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد
میں جہاں پر بھی گیا
ارض وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی
جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارض
فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک
فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے
فلسطیں آباد (17)

اردو مزاحمتی شاعری میں حبیب جالب نے بھی فلسطین کے مسئلے کو نہایت مؤثر اور احتجاجی انداز میں پیش کیا۔ جالب کی نظم "یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی بچے" میں فلسطینی بچوں کو ظلم کے خلاف مزاحمت کی علامت بنایا گیا ہے۔ وہ فلسطینی جدوجہد کو واقعۂ کربلا کے تناظر میں دیکھتے ہیں، جہاں مظلوم حق و صداقت کے لیے ظالم قوتوں کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔ جالب کے نزدیک فلسطینی بچے صرف متاثرین نہیں بلکہ شعور، حوصلے اور استقامت کے نمائندے ہیں۔ ان کی شاعری میں احتجاج براہِ راست، تیز اور عوامی انداز میں سامنے آتا ہے۔ وہ ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں بیروت اور فلسطین کے خونیں واقعات کو قلم بند کرنا چاہیے تاکہ دنیا ظلم کی حقیقت سے آگاہ ہو سکے۔ اسی طرح احمد فراز، احمد ندیم قاسمی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، زہرہ نگاہ اور دیگر شعرا نے بھی فلسطین کے المیے کو اپنے اپنے اسلوب میں بیان کیا۔ ان شعرا کے ہاں فلسطین کبھی مظلوم ماں کی آہ بن کر ابھرتا ہے، کبھی بے گھر بچوں کی چیخ، کبھی شہداء کے لہو کی خوشبو اور کبھی عالمی ضمیر کے خلاف ایک احتجاجی استعارہ۔ ان تمام تخلیقات میں ایک قدر مشترک ہے: ظلم کے خلاف مزاحمت اور مظلوم کے ساتھ اخلاقی یکجہتی۔

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی
اٹھائے ہاتھوں میں اپنے حسینیت کا علم
ادیبو، شاعرو، دانشورو، سُخن دانو
کرو حکایتِ بیروت خونِ دل سے رقم
شکست جہل کو ہو گی شعور جیتے گا کرے گا جہل کہاں تک سرِ شعور قلم (18)

مزاحمتی ادب کے تناظر میں فلسطین کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے محمود درویش کے خیالات بھی نہایت اہم ہیں۔ درویش کے مطابق مزاحمتی شاعری وطن، شناخت اور انسانی آزادی کے دفاع کا نام ہے۔ یہی تصور اردو شاعری میں بھی نمایاں نظر آتا ہے، جہاں فلسطین محض جغرافیہ نہیں بلکہ ایک زندہ انسانی تجربہ بن جاتا ہے۔ اردو مزاحمتی ادب نے فلسطین کے مسئلے کو صرف سیاسی یا مذہبی مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے انسانی وقار، آزادی، شناخت اور انصاف کے مسئلے کے طور پر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادب میں جذباتیت کے ساتھ فکری گہرائی اور اخلاقی شعور بھی موجود ہے۔ اقبال نے جس فکری بنیاد کا آغاز کیا، فیض نے اسے عالمی انسانی جدوجہد سے جوڑا، اور جالب و دیگر شعرا نے اسے عوامی احتجاج کی طاقت عطا کی۔ یوں اردو شاعری میں فلسطین ایک مستقل استعارہ بن گیا ہے۔ ایسا استعارہ جو ظلم کے خلاف مزاحمت، مظلوم کے ساتھ یکجہتی، اور انسانی آزادی کے حق کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو کے یہ شعرا صرف فلسطینی عوام کے دکھ کو بیان نہیں کرتے بلکہ پوری انسانیت کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ زندہ ضمیر ادب ظلم کے سامنے خاموش نہیں رہ سکتا۔

فلسطین کا مسئلہ محض ایک جغرافیائی تنازع نہیں بلکہ ایک تاریخی، سیاسی، انسانی اور اخلاقی المیہ ہے جس نے دنیا بھر کے شعور کو متاثر کیا ہے۔ بیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک فلسطینی عوام بے دخلی، جبر، جنگ اور شناخت کے بحران سے گزر رہے ہیں۔ اس صورتحال نے عالمی ادب میں گہرا ردِّعمل پیدا کیا، اور شاعری بطور ایک حساس اور بیدار صنف اس درد کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ خاص طور پر ترقی پسند اور انسانی اقدار کے حامل شعرا نے فلسطین کو محض ایک دور دراز ملک نہیں بلکہ مظلومیت، مزاحمت اور انسانی وقار کی علامت کے طور پر دیکھا۔

پاکستانی نظم نے اپنے آغاز ہی سے ظلم، ناانصافی اور استحصال کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ تقسیم ہند، ہجرت، شناخت کا بحران اور سیاسی انتشار جیسے تجربات نے پاکستانی شعرا کے شعور کو پہلے ہی حساس بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب فلسطین میں ظلم اور بے انصافی بڑھی تو پاکستانی شعرا نے اسے محض خبر کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اپنے اجتماعی دکھ کا حصہ سمجھا۔ ان کی نظموں میں فلسطین ایک دور کی سرزمین نہیں بلکہ وہ زخم بن کر ابھرتا ہے جو پوری انسانیت کے ماتھے پر ثبت ہے۔

اس حوالے سے فیض احمد فیض کی نظمیں ہیں۔ ان میں ایک نظم "فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے" مجموعہ "مرے دل مرے مسافر" کا حصہ ہے، اور یہ فیض احمد فیض نے بیروت قیام کے دوران 1980 کی دہائی میں لکھی تھی۔ خاص طور پر یہ نظم جون 1982ء کے بعد کے حالات سے جڑی ہوئی ہے، جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا اور فلسطینیوں کو بیروت سے نکلنا پڑا۔ اس نظم میں فلسطینی جدوجہد اور شہداء کی قربانی کے ساتھ فیض کا عملی اور جذباتی تعلق واضح طور پر نظر آتا ہے۔

فیض احمد فیض کی نظم "فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے" ان کی سیاسی اور انسانی شعور کی ایک روشن مثال ہے۔ یہ نظم بیروت میں قیام کے دوران لکھی گئی، جب فیض نے فلسطینی عوام کی جدوجہدِ آزادی اور ان کی بے مثال قربانیوں کو قریب سے محسوس کیا۔ فیض کا یہ تجربہ محض مشاہدے یا افسانوی تفصیل نہیں بلکہ حقیقی تاریخی حالات اور فلسطینی مجاہدین کی روزمرہ جدوجہد سے جڑا ہوا تھا۔

نظم میں فیض نے فلسطینی شہداء کی قربانی، ان کے درد، جدوجہد اور وفاداری کو اپنے منفرد ادبی اسلوب کے ذریعے پیش کیا ہے۔ یہاں ذاتی احساسات کو پس منظر میں رکھتے ہوئے، وہ ایک اجتماعی درد اور انسانی المیے کو شاعرانہ زبان میں زندہ کرتے ہیں۔ بیروت کی مصائب زدہ فضاؤں، بمباری اور خوف و تنہائی کے حالات کے باوجود فیض کی نظم امید، عزم اور قربانی کی عظمت کو اجاگر کرتی ہے۔

یہ نظم مجموعے "مرے دل مرے مسافر" کا حصہ ہے اور فلسطینی عوام کے ساتھ فیض کی روحانی اور عملی وابستگی کا مظہر ہے۔ نظم میں فلسطینی شہداء کی قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے، فیض انسانی ہمدردی، سیاسی شعور اور عالمی انصاف کے تصور کو بھی

اپنی شاعری میں شامل کرتے ہیں۔ ان کی یہ نکتہ چینی نہ صرف انقلابی جذبے کو ظاہر کرتی ہے بلکہ ایک شاعر کے طور پر ان کی ذمے داری، نکتہ سنجی اور فکری وسعت کو بھی واضح کرتی ہے۔

فیض کی یہ نظم محض ایک بیان نہیں بلکہ ایک زندہ یادگار ہے، جو قارئین کو فلسطینی عوام کی قربانی، مزاحمت اور عزم کے ساتھ شعوری اور جذباتی طور پر جوڑتی ہے۔ اس کے ذریعے فیض نے بین الاقوامی انصاف اور مظلوموں کے ساتھ انسانی ہم آہنگی کا ایک لازوال پیغام پیش کیا ہے۔

فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے
میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن(19)

"فلسطینی شہداء جو پردیس میں کام آئے" میں فیض احمد فیض نے فلسطینی شہداء کو اجنبی زمین میں قربانی دینے والا قرار دیا ہے۔ یہاں "پردیس" کا لفظ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ فلسطینی اپنے وطن کے لیے نہ صرف اپنے علاقے میں بلکہ اجنبی زمین میں بھی جدوجہد کر رہے ہیں۔ فیض نے اس کے ذریعے قربانی، اجنبیت اور وطن کے ساتھ محبت کے پیچیدہ جذبات کو ایک سادہ مگر گہری زبان میں پیش کیا ہے۔

اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا
تیرا

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا
شرق اور مغرب میں کھرے ہوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا
ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا(20)

احمد ندیم قاسمی کی یہ نعت بظاہر حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت کا اظہار ہے، مگر اس کے باطن میں تاریخ، تہذیب، طاقت، ظلم اور مزاحمت کے گہرے اشارے بھی موجود ہیں۔ قاسمی یہاں صرف روایتی مدح نگاری نہیں کرتے بلکہ نعت کے اندر ایک وسیع تاریخی اور سیاسی شعور بھی سمو دیتے ہیں۔ یہی پہلو اس نظم کو فلسطین کے تناظر میں بھی بامعنی بناتا ہے، کیونکہ مسجدِ اقصیٰ اور بیت المقدس کا حوالہ محض مذہبی یادگار نہیں بلکہ ایک زندہ سیاسی اور انسانی مسئلہ بھی ہے۔

فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے بعد امجد اسلام امجد پاکستانی شعری منظر نامے میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ جہاں فیض کی شاعری میں مزاحمت، عالمی مظلومیت اور احتجاج کی واضح جھلک ملتی ہے، اور احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں علامتی اور روحانی زاویے سے انسانی اور تاریخی شعور جھلکتا ہے، وہیں امجد اسلام امجد نے اپنی نظموں میں انسانی تجربات، اجتماعی مسائل اور اخلاقی بصیرت کو روزمرہ زندگی کے چھوٹے مگر اہم مناظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اسرائیل کی قابض طاقتیں فلسطینی عوام پر مسلسل مظالم ڈھا رہی ہیں۔ فلسطین کے شہر تباہ ہو رہے ہیں، لوگ اپنے گھروں سے بے دخل ہو رہے ہیں اور ہر طرف دہشت و خوف کا راج ہے۔ امجد اسلام امجد اسی شکستہ ریاست کے ایک حساس فرد ہونے کے ناطے فلسطینی سیاسی و ملکی حالات کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میری خواہش ہے کہ دنیا جنت نظیر بن جائے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری سرزمین پر ایسے لوگ قابض ہے جو نفرت پھیلاتے ہیں۔ ہر طرف خوف و بے سکونی ہے۔ سیاسی نمائندے اپنے مفادات کو حاصل کرنے میں لگے ہیں۔ جس کی وجہ سے ملک میں دہشتگردی عام ہو گئی ہے۔

نظم "جہاں ہم ہیں" میں بھی امجد اسلام امجد نے فلسطینی سیاسی و سماجی صورتحال کی لفظی تصویر کشی کی ہے کہ کس طرح قابض فوج اور ان کے حمایتی ہر گلی اور محلے کو کنٹرول میں رکھتے ہیں، اور فلسطینی عوام کو خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ ہر موڑ پر فوجی چوکی لگائی گئی ہے، مگر پھر بھی فلسطینی عوام پر ظلم جاری ہے۔ امجد اسلام امجد اس نظم کے ذریعے فلسطینی عوام کی زندگی میں پیدا ہونے والی انتشاری فضا اور لوگوں کے درمیان فاصلے کو واضح کرتے ہیں۔

یہ مجموعی رویہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ پاکستانی شاعری نے فلسطین کی تحریک، وہاں کے شہداء اور مظلوم عوام کی آواز کو اپنی تخلیقی روایت میں شامل کیا ہے۔ یہ شاعر اپنے کلام کے ذریعے نہ صرف فلسطین کے مسئلے کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر انسانی حقوق، انصاف اور آزادی کی آواز بھی بلند کرتے ہیں۔ فلسطین کی نمائندگی اردو ادب میں ایک مسلسل روایت کی طرح ہے، جو ظلم کے خلاف مزاحمت، قربانی، اور امید کی علامت بن گئی ہے۔ یہ روایت پڑھنے والوں کو فلسطینی عوام کی ہمت اور صبر سے روشناس کراتی ہے اور انہیں انسانی ہمدردی کے جذبے سے جوڑتی ہے۔ پاکستانی ادب نے فلسطین کو نہ بھلانے کی ٹھوس مثال قائم کی ہے۔ اردو شاعری کے ذریعے فلسطین کے انسانی، تاریخی، اور روحانی نقصان کی تصویر کو زندہ رکھا گیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک مضبوط ادبی یادگار فراہم کی گئی۔

حوالہ جات

1۔ القران، الاسراء: آیت ا
2۔ القران، سورت الأنبیاء: آیت 71
3۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر "مسلہ فلسطین "مکتبہ قرطاس، کراچی، 2023ء، ص 19،18
4۔ القران، الأنبیاء: 68–70
5۔ القران، الأنبیاء: 71
6۔ القران، العنکبوت: 26
7۔ نگار سجاد ظہیر: "مسئلہ فلسطین" 2023ء، ص 18–19
8۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر: "مسلہ فلسطین "مکتبہ قرطاس، کراچی، 2023ء، ص 26
9۔ ایضاً، ص 27
10۔ ایضاً، ص 28
11۔ القران، الإسراء: 1
12۔ القران، سورۃ الانبیاء 21:71
13۔ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر: "مسئلہ فلسطین "مکتبہ قرطاس، کراچی، 2023ء، ص 37
14۔ ایضاً، ص 39
15۔ پروفیسر حمید رضا صدیقی: "اقبال کی سیاسی بصیرت- بیکن بکس" ملتان 2005ء، ص 38
16۔ پروفیسر حمید رضا صدیقی: "اقبال کی سیاسی بصیرت- بیکن بکس" ملتان 2005ء، ص 41
17۔ فیض احمد فیض: "نظم فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے"
18۔ مستحسن رضا جامی: "اردو شاعری میں مسئلہ فلسطین" مراہ العارفین، 2023ء
19۔ فیض احمد فیض، "مرے دل مرے مسافر"، ادارہ: شاہین بک سینٹر، دہلی، سن اشاعت، 1982ء، ص 61
20۔ قاسمی، احمد ندیم "اندیشۂ زوال"۔ اشاعت کی تفصیل دستیاب نہیں۔ صفحہ 9۔ دستیاب آن لائن:
https://archive.org/details/20200105_20200105_0604 ۔

References:

1. Al-Qurʾān. (n.d.). Sūrat al-Isrāʾ, āyat 1.
2. Al-Qurʾān. (n.d.). Sūrat al-Anbiyāʾ, āyat 71.

3. Ẕahīr, Nigār Ṣajjad. (2023). Mas᾽alah Filasṭīn. Maktabah Qirṭās. pp. 18–19.
4. Al-Qur᾽ān. (n.d.). Sūrat al-Anbiyā᾽, āyāt 68–70.
5. Al-Qur᾽ān. (n.d.). Sūrat al-Anbiyā᾽, āyat 71.
6. Al-Qur᾽ān. (n.d.). Sūrat al-ʿAnkabūt, āyat 26.
7. Ẕahīr, Nigār Ṣajjad. (2023). Mas᾽alah Filasṭīn. pp. 18–19.
8. Ẕahīr, Nigār Ṣajjad. (2023). Mas᾽alah Filasṭīn. p. 26.
9. Ibid., p. 27.
10. Ibid., p. 28.
11. Al-Qur᾽ān. (n.d.). Sūrat al-Isrā᾽, āyat 1.
12. Al-Qur᾽ān. (n.d.). Sūrat al-Anbiyā᾽, āyat 71.
13. Ẕahīr, Nigār Ṣajjad. (2023). Mas᾽alah Filasṭīn. p. 37.
14. Ibid., p. 39.
15. Ṣiddīqī, Ḥamīd Raẕā. (2005). Iqbal kī siyāsī baṣīrat. Beacon Books. p. 38.
16. Ibid., p. 41.
17. Faiz, F. A. (1982). Mere dil mere musāfir. Shāhīn Book Center. p. 61.
18. Jāmī, Mustaḥsan Raẕā. (2023). Urdu shāʿirī meṅ mas᾽alah Filasṭīn. Mirā᾽at al-ʿĀrifīn.
19. Faiz, F. A. (1982). Mere dil mere musāfir. p. 61.
20. Qāsmī, Ahmad Nadīm. (n.d.). Andīshah-i zawāl. p. 9.